ڈاکٹر میاں مشتاق احمد

کلام فرید کے اردو تراجم

کسی سرزمین کا سب سے نمائندہ حوالہ اس کا ادب ہوتا ہے جو دراصل اس دھرتی، اس علاقے اور وہاں کے باسیوں کی اجتماعی سوچ، فکر اور رویوں کا نمائندہ اظہار ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی خطے کے اجتماعی شعور کو اس کے نمائندہ فن پارے میں جلوہ گر دیکھتے ہیں اور اس تخلیق کے ذریعے سے اس خطے کی حقیقی روح دریافت کی جاسکتی ہے۔ لیکن ہر خطے کی زبان مختلف ہوتی ہے اور انسان کے اجتماعی شعور میں کسی علاقے کا حصہ شامل کرنے کے لیے جس (میڈیم) وسیلے کی ضرورت پڑتی ہے اسے ترجمہ کہتے ہیں۔ یہ ترجمہ قومی زبانوں کی سطح پر بھی کیا جاتا ہے اور بین الاقوامی سطح پر بھی۔ ترجمے کا یہ عمل قومی یک جہتی اور انسانی وحدت کا مؤثر وسیلہ ہے۔ یہ قوموں، خطوں، نسلوں، فرقوں، عقیدوں اور سوچوں میں اشتراک کا سب سے مثبت اور کامیاب ذریعہ ہے۔

سرزمین بہاول پور پر خواجہ فریدؒ سب سے بڑا فنی وفکری حوالہ ہیں وہ اس علاقے کی زبان سرائیکی کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں فارسی زبان کا ایک قابل قدر اثاثہ بھی موجود ہے لیکن وہ تخلیقی شاہکار، جس کی وجہ سے وہ اس نمائندگی کے حق دار قرار پائے ان کی سرائیکی شاعری ہے۔ کلامِ فرید دنیا کی عظیم کلاسیکی شاعری ہے۔ اس کا فلسفہ شرفِ انسانیت ہے۔ تفہیمِ فرید کی پہلی منزل ہی اسلوبیاتی شعور ہے جس سے گزر کر فکرِ فرید کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ان کے ہاں تخلیقِ زبان کا عمل ہے جس میں علامتوں اور استعاروں کی تشکیل ہوئی ہے۔ یہ علامات و استعارات خالصتاً علاقائی ہیں اور اپنی تہذیب کے اندر بہت گہرائی تک

پیوست شدہ جڑیں رکھتی ہیں۔ عوامی زبان کو اتنی بلند عالمانہ سطح پر برت لینا، خواجہ فرید کا شاعرانہ کمال ہے، عوامی زبان میں اتنا عمیق اور وسیع علم سمو دینا اور اس میں اتنی گنجائش و وسعت پیدا کر دینا کہ وہ بہترین شاعرانہ زبان بن جائے، کلامِ فرید کا معجزہ ہے۔

خواجہ فرید کی شاعری کائناتی فکر اور انسانی اشرافیت کی بلندی کی تبلیغ کا نام ہے۔ انسانیت کا درد رکھنے والے اس ہادی نے دکھوں میں ڈوبے انسانوں کے علاج کا تردد کیا ہے اور انہیں اصل مقصد کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ اتنے پیچیدہ و خشک فکری نظام کو واضح کرتے ہوئے وہ، اپنے سالک یا قاری کو اسلوب کی گرفت میں لے لیتا ہے جس سے قاری ان کے کلام کی روح تک پہنچنے سے پہلے ہی انداز بیاں کے حسن اور آہنگ میں کھو جاتا ہے۔ کلامِ فرید ایسے لوگوں کے دلوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے جو فلسفۂ فرید کی گہرائیوں سے آشنا نہیں، وہ کلام فرید سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں اس لیے کلامِ فرید ان علاقوں میں بھی بڑے ذوق شوق سے سنا جاتا ہے جن کی زبان سرائیکی نہیں (۱) اس لیے ضرورت تھی کہ سرائیکی نہ جاننے والوں تک کلامِ فرید کے معانی پہنچائے جائیں اس مسئلے کا واحد حل صرف ترجمہ ہی ہے۔

میں اسے تفہیم فریدؒ کی تحریک قرار دیتا ہوں کہ میری دانست میں صرف غیر سرائیکی صاحبانِ علم ہی کے لیے نہیں بلکہ اہلِ زبان کے لیے بھی کلامِ فریدؒ کی تفہیم نہایت اہم ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس ہفت زبان دانش ور نے انہیں تک اپنی بات کا ابلاغ سب سے زیادہ ضروری سمجھا ورنہ وہ سرائیکی کی بجائے اس وقت کی علمی و تحریری زبان فارسی و اردو کا سہارا بھی لے سکتے تھے۔ ویسے بھی اگر ہم پیغامِ فرید کو سمجھ لیں تو پھر یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ آخر غالب و اقبال کے اردو کلام کے ڈھیروں اردو ترجمے کیوں کیے جا رہے ہیں۔ خاص طور پر جب سرائیکی خود اس خطے کے باسیوں کی بھی تحریر کی زبان نہیں بن سکی تو ظاہر ہے یہاں کے عام آدمی کے لیے بھی یہ متن اتنا ہی غیر مانوس ہے جتنا کہ سرائیکی نہ جاننے والوں کے لیے اور اتنے بڑے صوفی نے جو نکاتِ دانش کی پردہ کشائی کی ہے اس کے ظاہری اور سطحی معنی تو تفہیم و ابلاغِ مفہوم کا عمل کرنے کی بجائے ابہام پیدا کرتے ہیں اس لیے کلامِ فرید کو صحیح طور پر ہماری آج کی علمی و تحریری زبان (اردو) میں پیش

کیے جانے کی اہمیت مسلم ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور پہلو کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کلامِ فرید بصورتِ شعر ہمارے سامنے ہے اور آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ شاعری کی تفہیم سے زیادہ تعبیر ہوا کرتی ہے اگر اس شاعری کا ترجمہ بصورتِ شعر کیا جائے تو یہ واقعی محض تعبیر ہی رہ جاتی ہے مترجم وزن و بحر کی قیود میں بندھ کر رہ جاتا ہے منظوم تفہیم فریدؒ کے لیے ایک اور فرید کی ضرورت ہوتی ہے اور فرید روز کہاں پیدا ہوتے ہیں نتیجتاً ابہام کا خدشہ سوا ہو جاتا ہے۔ اس لیے باوجود یہ کہ کلامِ فرید کے منظوم تراجم کی ایک فہرست ہمارے سامنے ہے میں صرف مکمل نثری تراجم تک اپنی گفتگو کو محدود رکھوں گا، محدود اس لیے کہ مجھے اس بات پر بھی اصرار ہے کہ تبرکاً کیے گئے تراجم بھی حقیقت کا صرف جزوی حصہ ہی پیش کرتے ہیں اور یہ راستہ بھی ابہام کی بھول بھلیوں کی طرف جاتا ہے جب کہ میں تفہیم فرید کی ضرورت کو بنیادی اہمیت دیتا ہوں صرف ایک مترجم جنابِ ظہور نظر کے ایک ترجمے سے مختصر سا اقتباس بطور مثال پیش کروں گا (کاش انہوں نے مزید تراجم کیے ہوتے!)

خواجہ فرید کی کافی کا سرنامہ ہے:

''میں تنزی دا حال آتے ڈیکھتاں ونج''

نظر صاحب لکھتے ہیں:

مجھ پر برہن کا حال — آ کر دیکھ تو جا
ہرن تلور اور ناریں
چلیں غضب کی چال — آ کر دیکھ تو جا
ساجن باگیں موڑ کہ بن میں
اب ہے بھوک نہ کال — آ کر دیکھ تو جا

نثری تراجم میں بھی مترجم کو ایک پہاڑ کاٹنا ہوتا ہے اور وہ ہے تدوینِ متن کا عمل، کیونکہ اگر مترجم کے پاس صحیح متن نہیں تو وہ تفہیم کی بجائے غلط فہمیوں کی تعمیر کرے گا اور کج بنیاد پر کی گئی یہ تعمیر بیان کی اصلیت کو مسخ کر کے رکھ دے گی۔ لہٰذا تقریباً سارے اردو مترجمین نے تدوینِ متن

کے فرائض بھی نباہنے کی حسبِ استطاعت سعی کی ہے لیکن اس تدوین کی تنقید بھی ہمارا آج کا موضوع نہیں ہے۔ کلامِ فرید کے مکمل نثری تراجم میں عزیز الرحمان، نور احمد فریدی، مہر عبدالحق، حمید اللہ ہاشمی اور طاہر محمود کوریجہ کے تراجم شامل ہیں۔

نور احمد فریدی کے مطابق ماہ نامہ ''الفرید'' جگو والہ ملتان کے ۱۹۲۸ء کے چند شماروں میں مولانا غلام رسول جام پوری نے خواجہ فرید کی پہلی چند کافیوں کا ترجمہ کیا۔ ۱۹۴۳ء۔۱۹۴۱ء میں ماہنامہ ''العزیز'' بہاول پور کے بعض شماروں میں کلام فرید کی منتخب کافیوں کے ترجمے مولانا نور احمد خاں فریدی، جسٹس محمد اکبر خاں، مولانا طالوت اور مولانا عزیز نے کیے۔ ۱۹۴۴ء میں والیٔ ریاست بہاول پور کے حکم سے ادارہ دارالتالیفات نے پہلی بار مکمل دیوان فرید مع ترجمہ شائع کیا۔ ۱۹۵۶ء میں جامعہ اویسیہ بہاول پور کی طرف سے خواجہ محمد یار کا ترجمہ سامنے آیا جو صرف بتیس کافیوں پر مشتمل تھا مگر بڑی حد تک تفہیم فرید کے لیے صحیح خطوط کی نشان دہی کرتا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں بزمِ ثقافت ملتان، کی طرف سے کلام فرید کے نام سے دیوان فرید کی ۱۵۹ منتخب کافیاں مع نثری ترجمہ شائع کی گئیں۔ بزم ثقافت ملتان ہی کی طرف سے شائع ہونے والی فریدیات پر خوب صورت تنقیدی کتاب پریت مہار شائع ہوئی اس میں کلامِ فرید کی دس منتخب کافیوں کا ترجمہ شامل کیا گیا، یہ ترجمہ ریاض انور اور عبدالکریم تونسوی نے کیا۔ ۱۹۶۷ء میں اردو اکیڈمی بہاول پور سے شائع ہونے والے ڈاکٹر مہر عبدالحق کے مقالے ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق میں ۹ نو منتخب کافیوں کے تراجم شامل ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں اسی اکیڈمی نے دیوان فرید کی سو منتخب کافیوں کا ترجمہ دلشاد کلانچوی سے کرایا اور ۱۹۸۱ء میں نور احمد فریدی نے دیوان فرید کا اردو ترجمہ وتشریح شائع کیا۔ ۲۰۰۱ء میں حمید اللہ ہاشمی کا ترجمہ مکتبہ دانیال لاہور سے شائع ہوا اور تا حال آخری ترجمہ خواجہ طاہر محمود کوریجہ کا ہے جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔

نواب بہاول پور نے اپنی ریاست کے ادارے ''دارالتالیفات'' کے عزیز الرحمان عزیز کو دیوان فرید معہ اردو ترجمہ کے مرتب کرنے کا حکم دیا۔ مولانا عزیز کے کچھ امتیاز ایسے ہیں جو شاید ہی کسی دوسرے مترجم کے حصے میں آ سکیں وہ خود شاعر تھے اور خواجہ صاحب کے ہم عصر تھے، لہٰذا

کلامِ فرید کے تمام تر قلمی نسخوں تک ان کی رسائی آسان تھی، پھر یہ کام تو ریاست کی طرف سے ہو رہا تھا اور ایک سرکاری ادارے کے بھرپور اختیار و وسائل انہیں مہیا تھے، یوں مولانا عزیز کلامِ فرید کی تحقیق و تدوینِ متن کی پیچیدہ اور دشوار ذمے داری بھی بہ طریق احسن نبھا سکے اور اب وہ تفہیم فرید کی تحریک میں اس مقام پر ہیں جہاں تفہیم غالب میں حالی کا درجہ ہے۔ مولانا عزیز کی ایک سرکاری حیثیت تھی، وہ ریاست بہاول پور کے جج، میونسپل سلطانی کے نگران اور ادارۂ دارالتالیفات کے سربراہ تھے اور پھر خاص طور پر یہ کام تو والیٔ ریاست کی خواہش اور حکم سے کرایا جا رہا تھا سو ان لوگوں نے مولانا عزیز کے ساتھ مل کر دیوانِ خواجہ کا ایک خوب صورت ترجمہ ترتیب دیا۔ اس ترجمے کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ سرائیکی زبان کا رسم الخط اسی موقع پر طے ہوا۔

اس ترجمے کی بڑی خصوصیت علامہ طالوت کا مقدمہ ہے جو آج تک پیش کیے جانے والے مقالاتِ فریدیات پر اولیت کا تاجور ہے۔ فکرِ فرید کے مختلف پہلوؤں پر عمدہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور اس میں جو نکات اٹھائے گئے ہیں، وہ آج بھی ماہرینِ فریدیات کے لیے مینارہ نور ہیں۔ اس مقدمے کے ذریعے کلامِ فرید کی تفہیم کی تحریک بھرپور انداز میں آگے بڑھنا شروع ہوئی۔ سو سے زائد صفحات پر مشتمل، یہ مقدمہ بلاشبہ، اس لائق ہے کہ اسے مقدمہ شعر و شاعری کی طرح الگ سے شناخت ملے۔

اس ترجمے کی اہمیت اس کے دورِ اشاعت کی وجہ سے بھی ہے اور اس کے مرتبین کے باعث بھی۔ اس زمانے میں خود کاتبِ فرید بقیدِ حیات تھے، خلفائے فرید موجود تھے۔ وہ لوگ موجود تھے جن کی تربیت خود خواجہ نے کی، ایسے لوگ موجود تھے جن کو حضرت خواجہ کی مجلسیں نصیب ہوئیں پھر والیٔ ریاست بہاول پور جیسے مریدِ صادق موجود تھے ان کے دبیر الملک مولانا عزیز موجود تھے، نصیر الدین خرم جیسے بے بدل شاعر موجود تھے، مولانا عبدالرشید نسیم طالوت اور جسٹس اکبر جیسے صاحبِ علم موجود تھے۔ ان تمام حضرات کے ذوق وشوق کے ساتھ ساتھ ریاست بہاول پور کے مہیا کردہ وسائل موجود تھے۔ اس کام کی اہمیت ریاست بہاول پور کے سرکاری ادارے ''دارالتالیفات'' کی وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے جس کے ناظم مترجم ہٰذا مولانا عزیز تھے۔

اس ترجمے کی اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ سرائیکی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ ہونے والی پہلی کتاب ہے یہ کلامِ فرید کا پہلا مکمل ترجمہ ہے اور جتنے وسائل اور جذب وشوق کے ساتھ اہلِ علم نے مل کر کلامِ فرید پر کام کیا۔ اس طرح سرائیکی زبان کی کسی بھی کتاب پر کام نہیں ہوا۔

ترجمہ نور احمد فریدی کا تجزیہ:

مولانا فریدی کا یہ ترجمہ کلامِ فرید ۱۹۸۱ء میں مکمل ہوا اس ترجمے میں خود حضرت خواجہ کے بتائے ہوئے معنوں سے مدد لی ہے اور اس سلسلے میں ملفوظات خواجہ سے حوالے دیے ہیں۔ مولانا فریدی ترجمہ وتشریح کے دوران مختلف بزرگوں اور فلاسفروں کے اقوال نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ بڑی روانی سے ابن العربی، حضرت فخر جہاں خواجہ، خود حضرت خواجہ، سعدی، رومی، شیخ عبدالقادر جیلانی، بلھے شاہ، سچل سرمست کے اقوال نقل کرتے جاتے ہیں۔ وہ اپنی پسند کے موضوع پر بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں اور اپنی عبارت کو حوالوں اور اشعار سے وقیع بناتے ہیں۔

مترجم صوفی منش آدمی ہیں وہ فرید کو شاعر ماننے پر راضی نہیں وہ تو فرید کو مرشد پاک ہی مان سکتے ہیں یوں بہ طور محقق اور ناقد کے تجزیہ بڑا مشکل ہو جاتا ہے مگر مولانا فریدی کی مجبوری یہ ہے کہ ان کا مزاج انہیں اس سے ادھر ادھر دیکھنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ مہلت، یوں اس ترجمے کا سب سے اہم مسئلہ مترجم کا مزاج بن جاتا ہے۔ بہت سی ایسی کافیاں ہیں جن میں خواجہ فرید نے بہ طور رومانی شاعر کے اپنے کمالات دکھائے ہیں۔ مترجم کے مطابق ہمہ اوست سے زیادہ کچھ نہیں اس کی واضح مثال جلد دوم ص ۲۶۶ کافی ۱۶۷ ہے جس کا مطلع ہے ''آ چنوں رل یار..... پیلوں پکیاں نی وے'' اس پر وحدت الوجود کا غلاف چڑھانے کے لیے مترجم کو چار سے زیادہ صفحات کا نوٹ لکھنا پڑا۔

مولانا فریدی کے پاس ایک لگا بندھا سا انداز نظر آتا ہے جسے وہ ہر شہ پارہ فرید پر منطبق کیے جاتے ہیں حتیٰ کہ کافی ۱۳۲ میڈا عشق وی توں میڈا یار وی توں جو بشرط قبولیت ''مراتب انسان'' یعنی مردِ قلندر کی حیثیت ظاہر کرتی ہے درجات خداوندی کے طور پر بیان کر دی۔ یہ وہ

بنیادی نقص ہے جو مولانا فریدی کی شرح کو صرف وحدت الوجود کی شرح بنا دیتا ہے۔ مولانا نے آزاد ترجمے کے اصول پر عمل کیا ہے وہ صوفی منش اور فلسفۂ وحدت الوجود پر یقین رکھنے والے تھے اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق فرید کو بھی لاشعوری طور پر انہی قیود کا پابند بنانا چاہتے ہیں یوں اس ترجمے میں مولانا فریدی کا ذاتی مزاج جھلکتا ہے۔

''پیامِ فرید'' از ڈاکٹر مہر عبدالحق کا جائزہ:

پیام فرید، خواجہ فرید کے سرائیکی کلام کا تیسرا مکمل اردو ترجمہ ہے۔ جو ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق کا موضوع ''سرائیکی زبان اور اردو کا تعلق'' ہے دونوں زبانوں کے ماہر ہیں۔ پاکستان میں خواجہ فرید پر ہونے والی تاحال واحد ڈاکٹریٹ ''فلسفۂ فرید کی جہات'' کے نگران ہیں۔ ڈاکٹر مہر تحقیق میں ہم ایسے مبتدیوں کی بات بھی سننے اور غور کرنے کا مزاج رکھتے تھے۔ وہ میرے تحقیقی موضوع ''تفہیمِ فرید'' پر میرے ساتھ مسلسل بحثیں کرتے رہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے کم ہی کوئی نکتہ زیر بحث ترجمے ''پیام فرید'' میں شامل ہے۔

اس ترجمے میں ڈاکٹر مہر نے کلامِ فرید کو روایتی ترتیب سے ہٹ کر مرتب کیا ہے۔ انہوں نے خواجہ فرید کی سرائیکی کافیوں کو موضوع وار اکٹھا کر کے فکرِ فرید کو واضح کرنے کی کوشش ہے۔ اس ترمیمی ترتیب کی بنیاد اور جواز تفہیمِ فرید ہے۔ کیا واقعی یہ ابواب بندی موضوعاتی قطعیت لیے ہوئے ہے؟ جس کا تسلی بخش جواب میسر نہیں۔ یوں قاری ''پیام فرید'' کو جس توقع اور ضرورت کے لیے کھولتا ہے اسے مایوسی ہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مہر نے متن میں کچھ ترامیم بھی کی ہیں لیکن کسی بھی ترمیم یا تصحیح کی بنیاد کا حوالہ نہیں دیا۔ یہ قابل اعتراض عمل ہے خاص طور پر ایک باقاعدہ محقق سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی۔

یہ ترجمہ ۱۹۷۳ء سے موجود تھا۔ چودہ سال بعد ۱۹۸۷ء میں شہزاد قیصر نے اس کتابت شدہ مسودے کو چھاپ دیا، لہٰذا اس میں طباعت کے کئی نقائص رہ گئے۔ ص ۷۰ میں کافی کا شعر عنوان بناتے ہیں۔ ''تیغ برہوں دی ویہہ گئی'' یہ اس کافی کے مقطعے کا مصرعہ تھا اور اس میں فرید

تخلص آنا تھا اور مصرعہ یوں تھا کہ ''تیغ فرید برہوں دی ویہہ گئی'' جو سہواً رہ گیا تو اس کا پروف یقیناً کسی نے نہیں دیکھا ورنہ یوں کس طرح ممکن تھا کہ ایک شاعر کے کلام کا مرتب عنوان میں ہی پورا لفظ اور وہ بھی تخلص چھوڑ دے۔ص ۱۷۷ کافی ۶۲ کا آخری بند میں لفظ ''جلیساں'' کو ''جھلیساں'' لکھ دیا ہے اور پھر ترجمہ بھی جھلیساں ہی کا کر دیا ہے اس بنیادی ٹیڑھی اینٹ نے اوج تک وہی تحریف نافذ کر دی ہے۔

اس ترجمے میں معنوی نقائص بھی موجود ہیں۔اس میں کچھ لفظوں کے معنی دیکھیے جو قابل بحث ہیں مثلاً ص ۲۳ کافی ابند ۳ میں لفظ ''ڈہر'' کے معنی لکھتے ہیں۔ ''پھیلی ہوئی ریت کے وسیع میدان'' حالانکہ ڈہر کی زمین تو اتنی سخت ہوتی ہے کہ موجودہ زمانے میں وہ فوجی مشقوں میں ہوائی اڈے کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر مہر روہی کے اس بنیادی جغرافیائی تصور سے شاید آشنا ہی نہیں تھے ورنہ وہ انہیں ریتیلے تو ہرگز نہ کہتے۔ص ۱۸۰ کافی ۶۴ کے پہلے بیت میں لفظ ''پرائے'' کے ترجمے ''دوسروں کے'' لکھتے ہیں لیکن حل لغات میں ''پرائے'' کے معنی ''فکر، چنتے'' لکھتے ہیں۔ یہ کیسی عدم مطابقت ہے؟

کچھ مقامات پر ان کا حسنِ ترجمہ دامن دل کھینچتا ہے۔مثالیں دیکھیں ص ۲۵ کافی ابند ۸ میں لفظ ''ابل'' کا ترجمہ ''تعجیل'' کر کے قدرتِ بیان کا ثبوت دیا ہے۔ص ۳۰ کافی ۳ پہلے شعر میں ''نی وے'' کا ترجمہ ''کلمۂ ندائیہ'' کیا ہے جو ڈاکٹر مہر صاحب کی مترادفات پر قدرت کا ثبوت ہے۔ص ۸۹ کافی ۳۰ میں مصرعہ ہے ''متاں ونگیں لگم ٹکور'' لفظ ''متاں'' کا ترجمہ ''مبادا'' کیا ہے۔ص ۱۸۵ کافی ۶۵ پہلے شعر کے حل لغات میں ''پچلے'' کے معنی ''جھلسے'' ہوئے کرتے ہیں یہ مترادف عمدہ ہے اور حسنِ ترجمہ ہے ص ۲۰۸ کافی ۷۳ بند ۲ میں ''ناز چبولے'' کا ترجمہ ''خوش گفتاریاں'' اچھا مترادف دیا ہے۔ص ۲۶۹ کافی ۹۴ دوسرے بند کا مصرعہ ہے ''جیندیں ڈیکھاں سانول ساگی'' ترجمہ کیا ہے ''خدا کرے! جیتے جی اسے بہ نفسِ نفیس دیکھ لوں۔''

ترجمہ کلام فریدؒ از حمید اللہ ہاشمی کا جائزہ:

کلامِ فرید کی تیاری میں بہ قول مترجم انہوں نے ''مولانا عزیز کے مرتبہ نسخے کو بنیاد بنایا

ہے'' دوسری بات یہ کہ انہوں نے ''سہل، سادہ اور غیر مرصع زبان'' میں اور ''سیدھے سادے ترجمے کے ذریعے'' پیغام فرید کو عام لوگوں تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔

مترجمین کلامِ فرید میں حمید اللہ ہاشمی واحد شخص ہیں جو سرائیکی علاقے سے تعلق نہیں رکھتے، اس پوٹھوہاری اسکالر نے حلِ لغات کے حصے کو زیادہ اہمیت دی ہے اور وہ تمام سرائیکی الفاظ جو ایک غیر سرائیکی کے لیے غیر مانوس ہو سکتے ہیں ترجمہ سمیت بیان کیے ہیں۔اس ترجمے نے واقعتاً غیر سرائیکی حلقے میں تفہیمِ فرید کو وسعت دی ہے مثلاً ص ۲۴۰ پر ''بٹھ'' کے معنی لکھتے ہیں ''بھاڑ میں جائے۔''

ہاشمی کا بہ طور مترجم یہ عمل بھی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ افراط و تفریط سے دامن بچانے میں کامیاب رہے، نہ تو وہ عزیز یا کلانچوی کی طرح اصطلاحات کو ویسے کا ویسا چھوڑ کر گزر گئے اور نہ ہی مولانا فریدی کی طرح شرحِ اصطلاحات کے نام پر اپنے نظریات قاری پر تھوپنے اور شرح کے عمل کو نکات سلجھانے کی بجائے الجھانے کا ذریعہ بنایا۔جس کی بڑی مثال کافی نمبر ۲۳ ہے جس کا مطلع ہے ''سن سمجھ رے زاہد جاہدتوں ہن عشق دے اے کلمات عجب'' مولانا عزیز اپنے ترجمے میں صرف لفظ ''ہن'' کو ''ہیں'' میں بدل کر مصرعوں کی باقی عبارت پوری کی پوری ویسی ہی نقل کرتے جاتے ہیں۔ جب کہ مولانا فریدی پتا نہیں ان اصطلاحات سے کیا کیا معنی اخذ کرنا شروع کرتے چلے جاتے ہیں۔اس کافی کے حلِ لغات دیکھنے سے ہاشمی کے ترجمے کا امتیاز واضح ہو جاتا ہے، جنہوں نے معقول اختصار سے ہر اصطلاح کے معنی ایک عامی کو سمجھانے کی عمدہ کوشش کی ہے۔

ہاشمی کے ہاں پہلی مرتبہ کلامِ فرید کے فنی محاسن پر بھی حلِ لغات ہی میں گفتگو ہوئی ہے مثلاً اسی کافی کے اگلے بند میں لفظ ''پھر پھڑ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں ''اس کے متعلق حضرت خواجہ نے اپنے روزمرہ کا لفظ منتخب کیا ہے اور پھر وہی قافیہ بن گیا ہے جس سے فصاحتِ لفظی کے ساتھ معنوی بلاغت کا رنگ بھی نکھر آیا ہے۔''

ہاشمی کے ہاں ترجمے کا حصہ نہایت مختصر اور بہ قول ان کے ''غیر مرصع'' ہے۔ان کے ہاں

بعض مقامات پر ترجمہ مفہوم واضح کرنے کی بجائے الجھاتا چلا جاتا ہے جیسے ص ۱۴۷ کافی ۵۹ میں بارھواں شعر ہے ''تھل چترانگ اندر میں سسی = بیلیں بیٹیں ہیر'' ترجمہ کیا ''سسی تھل چترانگ میں فنا ہوگئی اور ہیر جنگل اور بیٹوں میں''۔ لیکن انہیں خود بھی مفہوم کے ابہام کا اندازہ ہوا تو تشریح کا عنوان بنا کر پھر لکھا ''اس شعر میں حضرت خواجہ نے عشقِ ناکام کا انجام بتا کر فرمایا کہ سسی تو ریت کے ٹیلوں اور میدانوں میں اور ہیر لبِ دریائی جنگلوں اور بیٹوں میں حیران و پریشان ہوئیں''۔ یعنی مفہوم بالکل الٹ کر دیا، اگر ہاشمی صاحب کافی مذکور کے مزاج و رجحان پر ہی غور کر سکتے تو اس سے پہلے شعر میں کہا جا رہا ہے ''جیسلمیر نرہائی مانو۔ تھی ڈوہیں کھنڈ کھیڑ'' یا اس سے پہلے کا ایک شعر دیکھیے ''ووٹھ کنوں تھئی دھرتی تھلڑی = ساگی ملک ملیڑ'' اس میں حیرانی و پریشانی کہاں ہے؟ یہ تو صاحبانِ عشق کے دائرۂ کار کی بات ہو رہی ہے جو اپنی اپنی حدود میں مقامِ عشق پا گئے۔

دراصل جیسے میں نے شروع میں عرض کیا ہاشمی صاحب کا کام ایک باہر کے آدمی کا اندازِ نظر ہے۔ وہ مفہوم کو لغوی معنوں میں اور عموماً سطحی معنوں میں مرتب کرتے جاتے ہیں۔ جو تفہیم کی بجائے الجھاؤ کا باعث بنتے ہیں۔

ترجمہ دیوان فرید از طاہر محمود کوریجہ:

میرے نزدیک اس دیوان کی بنیادی اہمیت تحقیقی ہے۔ تدوینِ کلامِ فرید ایک بڑا چیلنج تھا اسے خواجہ فرید کا معجزہ کہیے کہ اس بھاری پتھر سے سر ٹکرانے والے خود اسی خانوادے سے ہیں۔ خواجہ طاہر محمود کوریجہ اسی گھر کے چشم و چراغ اور وراثت کے حقیقی امین ہونے کے ساتھ ساتھ اہلِ علم کے ہاں اپنی محققانہ حیثیت کا سکہ بھی منوا چکے تھے سو تدوین کے سفر میں انہیں وسائل کی کمی کبھی نہیں رہی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کے پاس کچھ ایسا کلام بھی جمع ہو گیا جس کے بارے میں ہنوز فیصلہ ہونا باقی ہے۔ انہوں نے مستند ترین قلمی نسخوں سے تدوینِ کلامِ فرید کی ہے۔ ان کا چار سو قابلِ بحث الفاظ پر مشتمل جدول اس عمل کا بین ثبوت ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا تدوین کی تنقید میرے دائرۂ کار سے باہر ہے۔

اس دیوان کا مقدمہ فریدیات پر علامہ طالوت کی روایت کو آگے بڑھاتا ہے۔ لیکن طالوت اپنی تمام تر علمیت کے باوجود بغیر حوالہ دیے بات کرتے رہے حتیٰ کہ خواجہ فرید کے بارے میں علامہ اقبال کے بیانات تا حال توثیق کے طالب ہیں۔ جب کہ طاہر کوریجہ تحقیق کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہیں اور حوالے کے استناد کو تھام کر چلتے ہیں۔ یہ مقدمہ فریدیات کے اہم مباحث کو سمیٹے ہوئے ہے۔ افسوس کہ ہماری یونیورسٹیوں میں ایسے علمی کارناموں کی حوصلہ افزائی کا رویہ موجود نہیں ہے۔

اس ترجمے کی عمارت کے تین ستون ہیں: ۱۔ اجمال ۲۔ شعریت ۳۔ زورِ معنی

طاہر محمود کوریجہ فصیح البیان ادیب ہیں اور وہ کسی بھی موضوع پر گھنٹوں بے تکان بول سکتے ہیں، لیکن ترجمہ کلام فرید میں وہ ایک ایک لفظ کو بار بار سوچتے، اسے ہر زاویے سے ٹھوک بجا کر پرکھتے، اس پر اہلِ علم سے بحث کرتے ہیں اور تب کہیں جا کر اسے شاملِ ترجمہ کرتے ہیں۔ وہ ترجمے میں لفظ کے استعمال میں بے حد احتیاط کے قائل ہیں۔ ان کا تعلیمی پس منظر عربی و فارسی کا ہے جس سے انہوں نے بھرپور مدد لی ہے۔ وہ تقلیل الفاظ کے سفر میں عموماً مفرس تراکیب کو پسند کرتے ہیں، اضافت ان کا مرغوب تخلیقی رویہ ہے۔

خواجہ طاہر محمود شاعرانہ مزاج رکھنے والے پیر ہیں۔ ان کے ہاں لفظ اور اس کی مناسبتوں کا لطف ملتا ہے۔ عموماً ان کا ترجمہ ایک خاص طرح کا شعری آہنگ لیے ہوئے ہوتا ہے اور سرائیکی کلامِ فرید اردو یت کے رنگ میں ایک نئی شان سے نمود پاتا ہے، جس میں عربی و فارسی کی چاشنی اپنا رنگ دکھلاتی ہے۔ ترجمے کے نثریہ جملے مصرعوں کی سی چست بندشیں لیے ہوتے ہیں جس سے موزونیت کی کیفیت ترتیب پانے لگتی ہے۔

ان کے ہاں سلاست کے ساتھ بلاغت کی شرط ہے۔ وہ کسی بھی سرائیکی لفظ کے اردو مترادف کی تلاش و تعین کے عمل میں مفہوم کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں اور صورتی حسن کے ساتھ ان کی ٹکسال میں زورِ معنی کی اہمیت ہے وہ شدت تاثر کے قائل ہیں۔

کتابیات

۱۔ اشارات فریدی، مرتبہ مولانا رکن الدین، قلمی نسخہ، ملکیہ سیٹھ عبیدالرحمٰن بہاولپور
۲۔ پریت مہار، ریاض انور، بزم ثقافت، ملتان، ۱۹۶۳ء۔
۳۔ دیوانِ فرید، عزیز الرحمٰن عزیز، عزیز المطابع، بہاولپور، ۱۹۴۴ء۔
۴۔ دیوانِ فریدی، نور احمد فریدی، فقر الادب، ملتان، ۱۹۸۱ء۔
۵۔ دیوان فریدی، قیس فریدی، جھوک پبلشرز، خان پور، ۱۹۹۲ء۔
۶۔ دیوانِ فرید از جاوید چانڈیو، سرائیکی ادبی مجلس بہاول پور، ۱۹۹۸ء۔
۷۔ دیوانِ خواجہ فرید طاہر محمود کوریجہ، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء۔
۸۔ شرح دیوان فرید، محمد یار، مکتبہ اویسیہ بہاولپور، ۱۹۶۵ء۔
۹۔ کلامِ فرید، حمید اللہ ہاشمی، مکتبہ دانیال، لاہور، ۲۰۰۱ء۔
۱۰۔ کلامِ فرید، از ریاض انور، بزم ثقافت ملتان، ۱۹۶۳ء۔
۱۱۔ کلامِ فرید، صدیق طاہر، رحیم یار خان، ۱۹۸۸ء۔
۱۲۔ کلیات فرید، محمد افضل خان، پنجابی ریسرچ اکیڈمی، لاہور،
۱۳۔ لغاتِ فریدی از ڈاکٹر مہر عبدالحق، مطبوعہ اردو اکیڈمی، بہاول پور، ۱۹۸۲ء۔
۱۴۔ ملتان زبان اور اس کا اردو سے تعلق، عبدالحق مہر، اردو اکیڈمی، بہاول پور ۱۹۶۷ء
اور رسالہ العزیز، ماہنامہ، بہاول پور، ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۴ء کی پوری فائل۔

☆☆☆